Article

Revival of Culture in the Travelogues of Mustansar Hussain Tarar (In the Context of Northern Areas Travelogues)

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں تہذیب کی بازیافت

(شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کے تناظر میں)

Ubaid Ur Rehman *[1]
Ph.D Scholar, Department of Urdu, Lahore Garrison University, Lahore
Dr. Muhammad Arshad Ovaisi *[2]
Chairman, Department of Urdu, Lahore Garrison University, Lahore

عبید الرحمان*[1]

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمد ارشد اویسی*[2]

چیئرمین، شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

Correspondance: ubaid3153@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 16-10-2024
Accepted:21-12-2024
Online:25-12-2024

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle

Abstract: This study looks at the revival of culture in the travelogues of Mustansar Hussain Tarar, focusing on the northern areas of Pakistan. Tarar's writings show how human civilization has grown alongside the unique culture and history of these regions. His travel stories explore old traditions, showing a deep link between geography and how people live. The research highlights how the environment shapes cultural practices, especially seen in the five major festivals of the Ishkoman Valley. These festivals, from planting seeds to preparing for winter, show how people adapt to nature and work together as a community. Tarar's keen

insights encourage a fresh look at the cultural importance of northern Pakistan and call attention to its historical treasures. This study helps explain how local traditions keep their identity while connecting with broader civilizations. It not only honors the cultural wealth of these areas but also invites more research into Pakistan's rich and ancient heritage. By recording these traditions, Tarar's works act as a bridge between cultures and help preserve them for the future.

KEYWORDS: Travelogue, Northern Areas, Civilization, Culture, System of Thought and Perception, Social Values

distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

انسان کرہ ارض پر ایک لمبے عرصے سے زندگی گزار رہا ہے۔ ابتدا میں اس کی زندگی جنگلوں، غاروں تک محدود تھی تاہم آبادی کم ہونے کی وجہ سے اس کے لیے کھانا تو قدرتی طور پہ میسر تھا لیکن تحفظ نہ تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے اکٹھے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اکٹھے رہنے کے لیے انسان نے نئے ضابطے اور معیارات مقرر کیے جس پر انسانوں نے عمل کرنا شروع کیا۔ یوں ایک ایسا طرزِ زندگی سامنے آیا جو کسی بھی معاشرے کے انسانوں کی مجموعی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ انسان کا اعزاز ہے کہ وہ بہت ممتاز اور بہترین صفات سے متصف ہے اور اپنی معاشرتی زندگی کو ارتقا پذیری کے فطری رویے سے پروان چڑھاتا ہے۔

تہذیب اور انسان کا تعلق لازم وملزوم ہے جس کے مطالعہ سے انسانی زندگی کے کسی خاص دور میں اس کی مذہبی، اعتقادی، معاشی، لسانی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، فنی اور تکنیکی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انسان نے کائنات کے ساتھ جو پہلا رابطہ قائم کیا وہی تہذیب کا آغاز تھا۔ تہذیب اس معاشرت کا نام ہے جس میں انسان کا مشترکہ ذہنی اور مادی سرمایہ وجود میں آتا ہے تاکہ انسان کی ضرورتیں بدرجہ اتم پوری ہو سکیں نیز انسانی اقدار کی پرورش بھی ممکن ہو سکے۔ لہٰذا حضرت آدمؑ کی آمد کے ساتھ ہی تہذیب کا آغاز ہوا۔

تہذیب، تمدن، ثقافت اور کلچر کیا ہیں؟ عام طور پر ان الفاظ کو مترادفات کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ اپنی تفہیم میں ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن باہم پیوست بھی ہیں۔ ان پر الگ الگ بحث تو کی جاسکتی ہے لیکن انھیں

ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان میں کئی قدریں مشترک ہیں۔ ان سب کا تعلق معاشرے کے مختلف سماجی رویوں سے ہے۔ تہذیب بنیادی طور پر کسی معاشرے میں پائے جانے والے مجموعی عقائد اور رہن سہن کا نام ہے۔ ان عقائد میں مذہب بھی ایک بڑا اور بنیادی محرک ہے جو رہن سہن، رسم ورواج اور معاش تک پر اثرانداز ہوتا ہے۔ کسی قوم کا ذہنی ارتقا جو اس کی اجتماعی زندگی میں فعال کردار ادا کرے، تہذیب کہلاتا ہے۔ یہ ذہنی ترقی اس قوم کو ایک فکری احساس کا نظام بھی فراہم کرتی ہے۔ اسی ترقی کی بدولت رویوں میں تبدیلی کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ کسی قوم کے سماجی رویے اس قوم کی تہذیب کو جنم دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر تمدن بھی رہن سہن کا نام ہے اور ثقافت کسی علاقے کے رسم ورواج کا۔ یعنی تہذیب کو تمدن اور ثقافت سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور تہذیب کی صراحت کے لیے کلچر کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ تہذیب اور کلچر ایک سکے کے دورخ بھی قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کے مابین کیا فرق ہے؟ اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

> "پہلے میں ثقافت، تہذیب اور تمدن کے مابہ الامتیاز کو اجاگر کرنے کی جسارت کرتا ہوں کیوں کہ ہمارے ہاں کے زیادہ تر مباحث، محض اس لیے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکے کہ بحث کرنے والوں نے ثقافت، تہذیب اور تمدن کی حدود کا تعین نہیں کیا۔ اکثر لوگ، تہذیب کو انگریزی لفظ، کلچر (Culture) کے مترادف سمجھتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے تہذیب کو تمدن کا روحانی پہلو قرار دے ڈالتے ہیں جس سے بات الجھ جاتی ہے۔ میں اپنے اس مضمون میں کلچر کو کلچر یا ثقافت، سولائزیشن کو تہذیب اور اربن کلچر (Urban Culture) کو تمدن کے معنوں میں استعمال کروں گا۔" (1)

سبطِ حسن نے تہذیب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔" (2)

تہذیب کسی معاشرے کے طرزِ حیات اور اس کے فکر و احساس کا آئینہ دار نظام ہے۔ یہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں، جیسے طرزِ زندگی، زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے ذرائع، سماجی تعلقات، رہن سہن کے طور طریقے، اخلاق و عادات، رسوم و رواج، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد اور فنونِ لطیفہ کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ تمام عناصر تہذیب کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، اور ان کی ترتیب و تنظیم ہی تہذیب کا تعین کرتی ہے۔ تصورِ تہذیب

انسانی معاشرت کے ابتدائی تصورات میں شامل ہے، جو تاریخی عمل کے ساتھ مختلف مراحل سے گزر کر عصرِ حاضر تک پہنچا ہے۔ ہر دور میں تہذیب کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا، اور ہر مکتب فکر نے اسے اپنے منفرد نظریے کے مطابق بیان کیا۔ بعض اہلِ دانش نے اسے انسانی رہن سہن کا مظہر قرار دیا، کچھ نے اسے فنونِ لطیفہ سے تعبیر کیا، جبکہ دیگر نے اسے فکری اور ذہنی ارتقا کا نتیجہ تصور کیا۔ یہ اختلافات تہذیب کی وسعت اور اس کے متنوع پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔

سر سید احمد خان نے تہذیب کے موضوع کو اپنے فکری مباحث کا حصہ بناتے ہوئے اس کے جدید مفہوم کو اجاگر کیا۔ انہوں نے معاشرتی تغیرات اور تبدیلیوں کو انسانی کردار اور سماجی ڈھانچے کے ساتھ مشروط قرار دیا۔ ان کے نزدیک انسان قدرت کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جبکہ قدرت بھی انسان کی زندگی اور رویوں پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ یہی باہمی تعامل مختلف واقعات اور حادثات کو جنم دیتا ہے، جو معاشرتی ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سر سید نے تہذیب کے اس مفہوم کو بیان کیا جو انیسویں صدی میں مغربی دنیا میں مروج تھا، اور اس میں انسانی اور فطری عوامل کے متوازن ربط کو بنیاد بنایا۔ ان کے خیالات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ تہذیب ایک متحرک اور تغیر پذیر مظہر ہے، جو انسان اور قدرت کے درمیان تعلقات کی عمیق تفہیم کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

> "اس پرچے کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ
> کی سولائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس
> حقارت سے (سویلائزڈ) مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہووے اور یہ
> بھی دنیا میں معزز و مہذب قومیں کہلائیں۔"(3)

سبطِ حسن بیان کرتے ہیں کہ کسی بھی نئی یا پرانی تہذیب کی تشکیل پانچ بنیادی عناصر سے ہوتی ہے: (1) طبعی حالات، (2) انسانی شعور، (3) نظامِ فکر و احساس، (4) سماجی اقدار، اور (5) بیرونی اثرات۔ یہ عناصر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گہرے طور پر جُڑے ہوئے ہیں کہ ان کی علیحدگی ایک دشوار کام ہے۔ یہ عناصر نہ صرف ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ باہم مل کر تہذیب کی مجموعی ساخت کو تشکیل دیتے ہیں۔ ہر تہذیب اپنے مخصوص جغرافیے اور منفرد عناصر کے باعث دیگر تہذیبوں سے مختلف ہوتی ہے، اور یہی اس کی انفرادیت کو واضح کرتی ہے۔ ان کے مطابق، تہذیب ایک زندہ مظہر ہے جو انسانی شعور اور فطری و سماجی عوامل کے پیچیدہ تعامل کا نتیجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہر تہذیب کا اپنا ایک مخصوص جغرافیہ ہوتا ہے اس کے دریا اور پہاڑ، جنگل اور میدان، پھل پھول اور سبزیاں، چرند پرند، آب و ہوا اور موسم یعنی اس کا خارجی ماحول اس کے طرزِ عمل، ذریعہ معاش، رہن سہن، خوراک و پوشاک، مزاج و مذاق، اخلاق و عادات، جذبات و احساسات غرضیکہ اس علاقے کے انسانوں کی زندگی کے ہر پہلو پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریگستانی علاقوں کی تہذیب قطب شمالی کے برف پوش میدانوں کی تہذیب سے مختلف ہوتی ہے۔"(4)

دنیا کے مختلف علاقوں کے طبعی ماحول ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور طبعی ماحول کا اثر تہذیب پر بہت گہرا ہوتا ہے کیوں کہ جس قسم کا ماحول ہو گا وہاں پر تہذیبی اثرات بھی ویسے ہی ہوں گے۔ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کے رہن سہن، وضع قطع، رفتار و گفتار، زبان و ادب، موسیقی ہر چیز میں پہاڑوں کی سی سختی اور پہاڑوں کا سا وقار نظر آئے گا اور زرخیز علاقے میں رہنے والوں کی زندگی میں بھی بہت زرخیزی دکھائی دے گی کیوں کہ وہاں زمین نرم اور زرخیز ہو گی۔ ایسے خطے میں رہنے والوں میں فنون لطیفہ میں دل چسپی ہو گی کیوں کہ طبعی ماحول بڑی شدت کے ساتھ انسان کے ذہن پر اثرات مرتب کر جاتا ہے۔

فکر و احساس دراصل ایک خاص مزاج کا نام ہے۔ یعنی کوئی قوم کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرے یہی اس قوم کا طرزِ احساس ہے۔ نظام فکر و احساس میں تبدیلی کے نتیجے میں معاشرے کی تخلیقی بنیاد وہ نہیں رہتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ انسان نے اپنے روزمرہ کے سماجی تجزیوں کی بنیاد پر اپنے اردگرد کی چیزوں کی خصوصیات معلوم کر لی ہیں ور ان کو نام بھی دے دیا ہے۔ انسان کو جس چیز سے سکون ملتا اور جو چیز اس کو آرام دیتی اسے وہ پسند کرتا تھا اور جو چیزیں اس کی تکلیف کا باعث بنتی وہ اسے ناپسند کرتا تھا اور ان سے ڈرتا بھی تھا ان تکلیفوں سے بچنے کے لیے اس نے جادو ٹونے کا سہارا بھی لیا لیکن آج کا انسان بہت سے مسائل کا حل تلاش کر چکا ہے۔ اس نے بیماریوں پر قابو پا لیا ہے کیوں کہ پرانے دور میں انسان بیماریوں سے واقف نہ تھا اور وہ علاج بھی جڑی بوٹیوں سے کرتا تھا۔ اگر کسی جگہ شعور کی کمی یا تنزلی نظر آئے تو یہ اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ وہاں کے سماجی حالات اور پیداواری وسائل قدیم اور فرسودہ ہیں۔ ان میں زیادہ ترقی نہیں آئی اور ان کی زندگی پرانے انداز میں ہی چل رہی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں:

"یہ ضروری نہیں کہ ایک معاشرے میں تمام لوگ کسی چیز کی پسند یا ناپسند پر متفق ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ افراد قومی طرزِ احساس کے خلاف ہوں

> لیکن اس کے باوجود کسی قوم کے باشعور افراد کا طرزِ احساس اس قوم کا طرزِ احساس ہو گا اور اسی طرزِ احساس کی جماعتی باقاعدگی ”نظامِ فکر و احساس“ کہلائے گی۔ یہ نظام ہمیشہ یکساں نہیں رہتا بلکہ ہر دور میں ایسی تبدیلیوں کا ہونا ناگزیر ہے۔ وقت اور ضروریات کی مناسبت سے کسی قوم کی فکر میں اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ تبدیلی منفی بھی ہو سکتی ہے مثبت بھی۔“(5)

یہاں یہ بات اہم ہے کہ کلچر کا تعلق جغرافیے سے بہت گہرا ہے اور کلچر ایک دن میں پروان نہیں چڑھتا۔ اگر اس بات کو مد نظر رکھیں تو یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا پاکستانی کلچر کا کوئی وجود ہے؟ اگر کلچر ہے تو کیا وہ اسلامی کلچر ہے یا اسلام اس کی اساس ہے؟ مذہب کلچر کا حصہ ہے، کلچر نہیں، کیوں کہ مذہب بذات خود اگر کلچر یا تہذیب ہو تا تو تمام مسلمان ممالک میں تہذیبی سطح پر فرق نہ ہوتا۔

تہذیب یا کلچر میں مذہب ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اگر ہم پاکستانی کلچر کا لفظ استعمال کریں تو ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ پاکستان کی اساس کیا ہے؟ اگر ہمیں پاکستان کی اساس کا علم ہو گا تو یقیناً ہم پاکستانی کلچر کی اساس کا درست تعین کر سکتے ہیں۔ پاکستانی کلچر کے حوالے سے بہت سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کے حوالے سے سبط حسن نے ایسے سات گروہ گنوائے ہیں جو پاکستانی کلچر کے حوالے سے اپنے الگ الگ نظریات رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ پاکستانی کلچر کو اسلام یا نظریہ پاکستان کی بنیاد پر دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ اسے سندھ کی قدیم تہذیب کی موجودہ شکل قرار دیتے ہیں جب کہ ایک گروہ اسے علاقائی تہذیب قرار دینے کے درپے ہے اور دوسرا گروہ اسے سوشلزم کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ”ملکی کلچر کا تعلق جغرافیے سے ہے...... مثلاً پاکستان کا جغرافیہ، قدرتی سرحدوں سے مرتب ہوا جنھیں نظریاتی سرحدوں نے مزید مستحکم کر دیا ہے۔ یہ خطہ ان علاقوں پر مشتمل ہے جہاں آج سے ساڑھے چار ہزار برس پہلے وادی سندھ کا کلچر پروان چڑھا مگر وادی سندھ کے کلچر سے پہلے بھی یہ علاقہ پرانے پتھر کے زمانے سے دو مختلف انسانی نسلوں کی آماجگاہ رہا ہے۔“(6)

اس علاقے میں آنے والے فاتحین نے بھی یہاں کی تہذیب پر ان مِٹ نقوش چھوڑے۔ وہ اپنا کلچر ساتھ لائے اور انھوں نے یہاں کے کلچر کو بھی متاثر کیا۔ پہلے سے موجود زبان میں نئی نئی تبدیلیاں آئیں جس سے نئے لہجے،

رویے اور بولیاں تشکیل پائیں جو آگے چل کر نئی زبان بنانے میں مددومعاون ہوئیں۔ فاتحین کے کچھ کلچر اس علاقے کے کلچر میں مدغم ہوگئے اور کچھ نے اپنی شناخت جزوی طور پر برقرار رکھی۔ یہ تمام اثرات ہمیں آج بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ یہ بات اہم ہے کہ سب سے زیادہ اثرات مسلمان فاتحین کے ہوئے اور وہ جو کلچر لے کے آئے وہ آج بھی اس خطے کے رگ وپے میں موجود ہے۔ اس لیے اس خطے پر دیرپا اور گہرے اثرات اسلام نے ہی مرتب کیے ہیں:

> "اس کلچر کو اگر اسلامی کلچر بھی کہہ دیا گیا ہے تو کوئی یہ ناقابل قبول بات نہیں کیونکہ اس کلچر پر اسلام کے عقائد کا جتنا اثر نظر آتا ہے اتنا دوسرے عناصر مثلاً نسلی اور پرانی تہذیبوں کے عوامل کا نہیں۔"(7)

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تہذیب کو پروان چڑھانے میں جغرافیے کی حیثیت کلیدی ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب پر آریائی تہذیب کے اثرات واضح ہیں تو دوسری طرف اسلامی تہذیب نے بھی اسے متاثر کیا۔ کلچر کا وجود صدیوں کے ابعاد کا نتیجہ ہے اور اس میں تمام ذائقے محسوس کیے جاسکتے ہیں جو اس نے مختلف اوقات میں مختلف اقوام اور حالات سے کشید کیے ہوتے ہیں۔ گویا تہذیب ایک بہتا دریا ہے جو مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا اس علاقے سے ذائقے جذب کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جس میں پانی کے کئی دھارے اور چشمے شامل ہوتے ہیں جن میں سے کچھ میٹھے اور کچھ کسیلے ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ سوتے دریا سے الگ ہو کر اپنی انفرادی حیثیت میں مخصوص علاقوں کو سیراب کرتے ہیں جنھیں علاقائی کلچر کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کلچر کا یہ سفر بالآخر سمندر میں شامل ہو کر اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "دراصل کلچر ایک ایسا دریا ہے جو سدا اپنے منبع سے سمندر کی طرف بہتا ہے: ہم جس مقام پر اسے چکھیں گے، یہ اپنے منبع سے اس مقام تک کے جملہ ذائقوں کے امتزاج کو پیش کرے گا۔"(8)

پاکستانی تہذیب کے حوالے سے دو مکتبہ فکر نمایاں ہیں: ایک وہ جو یہاں کی تہذیب کی بنیاد اسلام پر رکھتا ہے۔ ہمارے ہیروز، زبان، خطاطی، مصوری، موسیقی، طرزِ تعمیر اور لباس کو اسلامی تہذیب کا نمائندہ قرار دیتا ہے۔ سبط حسن اس بات کے قائل دکھائی دیتے ہیں کہ تہذیب کا جزو مذہب ہو سکتا ہے مگر تہذیب کا کل نہیں ہو سکتا۔ سبط حسن لکھتے ہیں:

> "کوئی صحیح الدماغ شخص عربوں کی تہذیب اور انڈونیشی تہذیب کو ایک نہیں کہے گا۔ حالاں کہ دونوں مسلمانوں کی تہذیبیں ہیں۔ اس طرح ایران

اور مراکش یا افغانستان اور سوڈان کی تہذیبیں یکساں نہیں۔ کیوں کہ تہذیب مذہب کا جزو تو ضرور ہے لیکن نہ تو تہذیب کی بنیاد مذہب پر قائم ہے اور نہ مذہب کے حوالے سے اس کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مراکش سے ملایا تک مسلمان کی تہذیبوں میں کوئی فرق نہ ہوتا۔“(9)

دوسرا مکتب فکر بھی عجیب منطق پیش کرتا ہے وہ ایک طرف تو علاقائی تہذیبوں کو مانتے ہیں مگر پاکستانی علاقے کی تہذیب کو ماننے سے انکاری ہیں۔ وہ پاکستان کو ایک جغرافیائی حقیقت تسلیم کرتے ہیں لیکن اس جغرافیائی حقیقت کی تہذیب کو کل ماننے سے انکاری ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اس جغرافیائی اکائی کی مختلف علاقائی تہذیبوں کے پرچارک ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک ملک میں علاقائی تہذیبیں تو موجود ہوں لیکن ملکی سطح پر تہذیب نام کی چیز سرے سے وجود ہی نہ رکھتی ہو۔ علاقائی تمدن اور ثقافت مل کر کسی خطے کی مجموعی تہذیب کو جنم دینے کا کام سرانجام دیتے ہیں لیکن یہ مکتبہ فکر اسے ماننے سے انکاری ہے۔ پہلا مکتبہ وحدت کا قائل ہے جب کہ دوسرا کثرت کا۔ دونوں نظریات میں ٹکراؤ کی صورت جاری و ساری ہے۔ اس ٹکراؤ کی نوعیت سیاسی ہے اور مرکز وصوبائی اختیارات پر منتج ہوتی ہے۔ یہ فکر لسانی فسادات کی شکل میں سامنے آئی ہے لیکن اس میں بھی سیاسی عمل کارفرما ہے۔ اصل میں دونوں مکاتبِ فکر کو اپنے نظریات سے زیادہ اپنے مفادات عزیز تھے ۔ گویا دونوں ہی اپنے مفادات کی عینک سے پاکستان اور اس کی تہذیب کو دیکھتے رہے اور اس کے مطابق نتائج چاہتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”پاکستانی تہذیب کا عنوان یقیناً تہذیب کا اسلامی تصور ہی ہے۔ یہ حقیقت مفکرین اور دانشوروں کے ہر مکتبہ فکر کو قبول کر لینی چاہیے۔“(10)

پاکستان کے شمالی علاقہ جات ، جن کا موجودہ نام گلگت بلتستان ہے جغرافیائی طور پر انتہائی اہم ہے۔ یہ خطہ پاکستان کے لیے نعمت ہے اور یہاں کی تہذیب میدانی علاقے کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ شمالی علاقہ جات کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں۔ کتابوں میں جس تاریخ کا ذکر ملتا ہے وہ لوک داستانوں اور دیومالائی قصوں پر مشتمل ہے۔ شمالی علاقہ جات کی تاریخ کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ بلتستان ہے جب کہ دوسرے حصے میں گلگت، ہنزہ، بروشال اور غذر وغیرہ آتے ہیں۔ بلتستان کے حصوں کو تاریخ میں مختلف ناموں مثلاً پلو، بلور، بالتی، تبت، بلتی وغیرہ سے پکارا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پر دیومالائی کردار ”کیسر“ کی حکومت تھی۔ یہاں کے لوگ مختلف اوقات میں مختلف مذاہب سے منسلک رہے۔ ان مذاہب میں ”بون چھوس“، ”زرتشت“ اور ”بدھ مت“ زیادہ اہم ہیں۔ ”بدھ مت“ کا آغاز دوسو قبل مسیح کے آس پاس شروع ہوا۔ اس کے بعد پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں یہاں پر

پلولا شاہی حکمران تھے یہ وہی دور ہے جس میں تبتیوں اور چینیوں کے مابین معرکے ہوتے رہے جن کے آثار پامیر میں قبروں کی شکل میں موجود ہیں۔ نویں صدی تک بلتستان تبت کا صوبہ تھا یہاں پر اسلام کا اثر و رسوخ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسویں میں بڑھنا شروع ہوا جب سکردو کے شاہی خاندان نے ایرانی نژاد مسلمان ابراہیم کو اپنا داماد بنایا۔ مقپون ابراہیم کے خاندان نے یہاں پر ساڑھے چار سو سال تک حکومت کی اسی دور میں یہاں اسلامی مبلغین سرگرم ہوئے۔ یوں یہاں پر ایک نئی تہذیب کا جنم ہوا اور لوگ بڑی تیزی سے اسلام کی جانب آئے۔ مقپون خاندان کا آخری حکمران احمد شاہ تھا جس سے ڈوگروں نے حکومت چھین لی اور ۱۸۴۰ء میں یہ علاقہ ڈوگروں کے قبضے میں چلا گیا۔

شمالی علاقہ جات کے دوسرے حصے دردستان میں "شن قوم" مختلف زمانوں میں وارد ہوتی رہی۔ یہ لوگ ہندوکش کو عبور کر کے یہاں آئے اور پہلے سے موجود یشکن قوم کے ساتھ خون ریز جنگیں لڑیں۔ یہاں کے لوگ (ہنزہ اور نگر) بروشسکی بولتے تھے۔ ان جنگوں میں شن غلب رہے اور یشکنوں نے ان کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا۔ اسی دور میں یہاں کی تہذیب میں بڑے پیمانے پر تبدیلیوں سے آشنا ہوئی۔ یہاں مذہبی سطح پر بھی بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری لکھتے ہیں:

> "قدیم زمانے میں اس علاقے کے لوگ مافوق الفطرت مخلوق پر اعتقاد رکھتے تھے، پھر بلخ کے قرب کی وجہ سے ان میں زرتشتی مذہب پھیلنے لگا۔ قبل مسیح میں ان علاقوں میں بدھ مت پھیل گیا۔ بارھویں صدی عیسیوی کے اوائل میں اس میں اسلام کا ورود ہوا۔ درد قبائل نے بدھ مت چھوڑ کر مذہب اسلام اختیار کر لیا۔"(11)

پاکستان کی جغرافیائی اکائی کے طور پر انتہائی اہم ہے۔ ایک طرف تو یہ کشمیر اور کے پی کے کے ساتھ منسلک ہے تو دوسری طرف یہاں ملکی سرحدیں چین، انڈیا اور افغانستان سے ملتی ہیں جب کہ واخان کا چھوٹا سا علاقہ اسے تاجکستان سے جدا کرتا ہے۔ تاریخی سطح پر اس علاقے کے چین کے ساتھ بہت روابط رہے ہیں جو آج بھی قائم ہیں۔ اس پورے علاقے کو ایک سڑک ملاتی ہے جسے دنیا کا عجوبہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس سڑک کی بنیاد ان راستوں پر قائم ہے جہاں سے کبھی چینی تاجر ریشم کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ اس سڑک کو شاہراہ ریشم یا قراقرم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علاقے سیاحتی مقامات کی وجہ سے بھی جانے جاتے ہیں۔ پاکستان کا یہ علاقہ برف پوش چوٹیوں سے بھرا پڑا ہے۔ دنیا کی دوسری بڑی چوٹی کے۔ ٹو یہاں پر ہے تو دنیا کی خطرناک ترین چوٹی نانگا پربت بھی اسی علاقے میں دنیا بھر کے سیاحوں کو اپنی طرف

کھینچتی نظر آتی ہے۔ آٹھ ہزار میٹر سے بلند سات چوٹیاں یہیں موجود ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سات ہزار میٹر سے بلند چوٹیوں کی تعداد ۱۰۷ کے لگ بھگ بنتی ہے۔ دنیا کے بڑے گلیشئرز یہاں پر موجود ہیں جن کی لمبائی کئی کلومیٹر ہے۔

پاکستان کے شمالی علاقوں میں مختلف علاقائی زبانیں وجود رکھتی ہیں لیکن اردو قومی زبان کی حیثیت سے ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ علاقے سیاحتی، تجارتی اور جغرافیائی حیثیت رکھتے ہیں یہاں اردو ادب اور سیاحت کے فروغ کے حوالے سے ایک ہی شخصیت کا نام معتبر ہے۔ وہ مستنصر حسین تارڑ ہیں۔ انھوں نے ان علاقوں کی سیاحت کی اور اپنے سفر نامے تحریر کر کے لوگوں کو معلومات پہنچائیں اور اپنے دلکش اسلوب کی بدولت لوگوں کے اندر تجسس پیدا کر دیا۔ ان کی سفر ناموں نے ایک طرف تو اردو سفر نامے کی صنف کو پروان چڑھایا تو دوسری طرف لوگ ان کے سفر نامے پڑھ کر جوق در جوق ان علاقوں کا رخ کرنے لگے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ درحقیقت شمالی علاقہ جات اور مستنصر حسین تارڑ کا نام لازم وملزوم ہو چکا ہے آج بھی لوگ ان کے سفر ناموں سے متاثر ہو کر وہاں کا سفر کر رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی خدمات کے نتیجے میں گلگت بلتستان نے انکو سیاحتی سفیر مقرر کیا ہے اور ان کے نام ایک ایوارڈ کا اجرا بھی کیا ہے۔ اسی علاقے میں ایک جھیل کو ان کے نام یعنی "تارڑ جھیل" سے موسوم کیا گیا ہے۔ مستنصر نے ان علاقوں کی سیاحت پر بارہ سفر نامے تحریر کیے ہیں۔ ان کا شمالی علاقہ جات کا آخری سفر نامہ ۲۰۱۷ء میں "حراموش ناقابل فراموش" کے نام سے سامنے آیا ہے۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں میں یہاں کی تہذیب کو دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔

مستنصر کو شمال سے محبت ہے اس محبت کا اظہار وہ جابجا کرتے نظر آتے ہیں۔ شمال میں انہیں انتہائی قدر ومنزلت حاصل ہے وہاں کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بدولت شمالی علاقہ جات پاکستانیوں کے سامنے آئے اور وہاں پر سیاحت کو فروغ ملا۔ مستنصر نے یہاں کی تہذیب کو اپنے سفر ناموں میں جابجا بیان کیا ہے کیونکہ مستنصر کا سفر خالی سڑک کا سفر نہیں بلکہ سفر میں حاصل ہونے والے تجربات اور احساسات کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک کوہ نوردی محض گاڑی میں بیٹھ کر پہاڑوں پہ جانے کا نام نہیں بلکہ وہ کوہ نوردی سے ایک ایسا سفر مراد لیتے ہیں جو وادیوں تک پاپیادہ ہو۔ ان کے سفر دیگر سیاحوں سے ہٹ کر ہیں بلکہ جہاں ایک عام سیاح کا سفر ختم ہوتا ہے وہاں سے مستنصر کے سفر کی ابتدا ہوتی ہے۔ اپنے سفر ناموں میں انہوں نے محض اپنے جذبات واحساسات کو بیان نہیں کیا بلکہ شمالی علاقہ جات کی تہذیب ومعاشرت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے وہاں کی تقاریب میں بھی شرکت کی اور مقامی کھیلوں کو دیکھا اور ان تمام مظاہر کو وہ اپنے سفر ناموں میں بیان کرتے ہیں۔ مستنصر کے خیال میں ہماری تہذیب کے دھارے پاکستان کے شمال میں بھی موجود ہیں لیکن ہم نے شمال کی طرف توجہ نہیں دی۔ ہم محض میدانی

علاقوں میں اپنی تہذیب بُنتے ہیں اور ہماری ساری تحقیق یہیں تک محدود ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمیں اپنی تہذیب کی بازیافت کے لیے شمال پر توجہ دینی چاہیے۔ شمال کی طرف توجہ نہ دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی یہی خیال کرتا ہے وہاں ہمیشہ گلیشئرز ہی تھے اور گلیشئرز میں تہذیب کیسے جنم لے سکتی ہے حالاں کہ شمال کی تہذیب بابل اور نینوا کی تہذیب سے بھی پہلے کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ پتن سے ملنے والے ایک ہار کا حوالہ دیتے ہیں:

> ڈاکٹر احمد حسن دانی کی سٹڈی میں گلگت کے ایک ماہر آثار قدیمہ سے ملاقات ہوئی۔۔ انہوں نے بتایا کہ امت کے سامنے دریا کے پار ایک قدیم قبرستان تھا جہاں سے چرواہوں کو سکے اور نوادرات ملتے رہتے تھے۔۔ کچھ لوگوں نے غیر قانونی طور پر وہاں کھدائی بھی کی اور جو ہاتھ لگا لے گئے۔۔ اب اسے محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور سائنسی بنیادوں پر کھدائی شروع ہو گی۔۔ ایک صاحب ان قدیم ڈھیریوں میں سے ملنے والی چند نادر اشیا ڈاکٹر دانی کے پاس لے کر آئے تھے تاکہ وہ ان کی تاریخی حیثیت اور قدامت کا تعین کر سکیں۔۔ ان میں سونے کے زیورات، کنگن، بندے اور گلے کے ہار بھی تھے۔۔۔"(12)

اس کائنات میں جہاں جہاں انسان ہیں وہاں وہاں ایک تہذیب موجود ہے ۔ دنیا کی تمام قدیم تہذیبیں دریاؤں کے کنارے پھلی پھولیں ۔ شمالی علاقہ جات کی بھی اپنی ایک منفرد تہذیب ہے جس کو مستنصر اپنے سفر ناموں میں سامنے لاتے ہیں ۔ شمال میں جہاں دریا موجود ہیں وہاں تہذیبی عناصر ملتے ہیں۔ تہذیب کس طرح جنم لیتی ہیں اور کس طرح آگے بڑھتی ہے؟ اس پر مذہب کا کیا اثر ہوتا ہے؟ اس موضوع پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ یہاں یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ کئی بار تہذیب اور ثقافت مذہب پر بھاری پڑ جاتی ہے۔ علاقائی روایات اور ضروریات ثقافت کا حصہ ٹھہرتی ہیں۔ تہذیب انسان کے رویوں اور سوچ کی عکاس ہوتی ہے۔ انسان جو سوچتا ہے، جو طرزِ عمل اختیار کرتا ہے وہی اس کی تہذیب بن جاتی ہے۔ انسان کی اپنی سوچ اور اس کے اپنے اصول ہیں جن کے سہارے وہ زندگی گزارتا ہے۔ جو اصول اسے پسند ہوتا ہے وہ اسی کو اپنی زندگی اور شعور پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مستنصر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "آپ جانتے ہیں انسانی حیات کے جتنے بھی روپ ہوتے ہیں، جہتیں متعین ہوتی ہیں، جو معاشی ثقافتی روایتی اور مذہبی اصولوں کے تحت ایک انسان

زندگی گزارتا ہے ان سب عوامل کی توجیہ ہر شخص اپنے مخصوص نقطہ نظر
سے کرتا ہے جو کسی نہ کسی فلسفے یا علمی سائنس پر مبنی ہوتا ہے۔یعنی اگر آپ
کا ذہن مذہب کے سوا اور کوئی فلسفہ قبول نہیں کرتا تو بیشک اطلاق ہو نہ ہو
آپ ہر شے پر اپنے مذہبی نظریے کا ٹھپا لگا دیتے ہیں، یعنی اسلامی بینکاری،
اسلامی ادب یا پھر طب نبوی وغیرہ۔۔"(13)

شمالی علاقہ جات کی تہذیب صدیوں پرانی ہے، یہاں ہر پربت، ہر پیڑ کسی نہ کسی روایت کا امین ہے۔ ہماری توجہ اس طرف ہو جائے تو یہ خزانہ سامنے آسکتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ راقم الحروف کو دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں:

"سارا برصغیر تہذیب سے بھرا پڑا ہے یہ عرب کا صحرا یا افغانستان نہیں
"پتن" سے جو ہار ملا تھا تقریباً چار ہزار سال پرانا تھا۔ اس کے منکوں سے یہ
معلوم پڑا کہ وہ کسی دیوتا کے لیے تھا ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ تہذیب
کیسے ختم ہوئی۔"(14)

مستنصر کے خیال میں شمشال ایک گمشدہ وادی تھی لیکن اس گمشدہ وادی کی بھی اپنی تہذیب تھی جسے مقامی لوگوں نے سنبھال رکھا تھا۔ ان کی کوششیں اسے صرف سنبھال کر رکھنے کے لیے نہ تھی بلکہ آنے والی نسل کے لیے بھی محفوظ بنانا تھا۔ یہاں ظروف تھے، قرآن مجید کے لیے رحل تھا، بڑے بڑے تسلوں، دیگچوں اور زرعی اوزار کے ڈھیر تھے۔ یہیں پہ موجود کھڈی، ترازو اور رباب انسانی تہذیب کو محدود دائرے میں مکمل کرتے نظر آتے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ تہذیب کسی بڑے شہر میں ہو اور چھوٹے قصبوں میں اس کا وجود نہ ہو۔ انسان بڑے شہروں سے ہٹ کر بھی اپنے تہذیبی آثار کو ساتھ لے کے چل سکتا ہے اور انھیں محفوظ بھی کر سکتا ہے۔ اہل شمشال نے اپنے اس قدیمی گھر کو سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ مستنصر کے لیے یہ تجربہ حیرت انگیز تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

"میرا تو یہ خیال تھا... اور ایک اور خواب خیال تھا کہ پہاڑوں میں گمشدہ ایک
وادی دریافت کرنے آرہا ہوں۔ شاید ایک نیم تہذیب یافتہ، تمدن سے
نا آشنا وادی۔۔۔ لیکن اس عجائب گھر کی کالک میں لتھڑے ہوئے 3 تاریک
مختصر گھر میں ظروف نے۔۔۔ ایک رحل نے جس پر کبھی قرآن رکھا جاتا
تھا، بڑے بڑے تسلوں اور دیگچوں نے، فنجانوں اور ابتدائی زرعی اوزار نے،

ایک کھڈی، ایک ترازو نے اور اس رباب نے ثابت کر دیا تھا کہ یہاں انسانی
تہذیب اپنے محدود دائرے میں مکمل تھی۔“(15)

تہذیب کے ساتھ طرزِ بود و باش اور لباس بھی زیرِ بحث آئے گا۔ شمالی علاقہ جات کی ہر وادی اس حوالے سے زرخیز ہے۔ کچھ لباس اور روایات مشترک ہیں اور کچھ میں بہت زیادہ فرق نظر آتا ہے۔ عام طور پر یہ وادیاں ایک دوسرے سے کٹی ہوتی ہیں لیکن آپس میں لوگوں کے تعلقات بحال ہوتے ہیں۔ سردی کے موسم میں یہ لوگ ایک دوسرے سے کٹ کر رہ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کچھ چیزیں مشترک ہے اور کچھ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لباس اور زیورات کے حوالے سے بھی ان میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مستنصر یہاں کے زیورات اور لباس کے ساتھ ساتھ مقامی حسن بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”تمام چہروں پر گل بوٹوں کی آرائش تھی۔۔ماتھوں پر سرمے سے بنے ہوئے ایسے نقش تھے جو میں نے صرف کالاش لڑکیوں کے ہاتھوں اور رخساروں پر دیکھے تھے۔۔یعنی چہروں پر ایسے نقش و نگار بنانا کافرستان کی قدیم تہذیب کا حصہ نہ تھا بلکہ یہ آرائش ان وادیوں کی ثقافت میں شامل ہے۔۔“(16)

مستنصر نے شمالی علاقہ جات کے کھیلوں کو بھی اپنے سفرناموں کا حصہ بنایا ہے۔ شمالی علاقہ جات میں پولو کے کھیل کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ پولو کی مختلف ٹیمیں اپنے اپنے علاقوں کی طرف سے کھیلتی رہتی ہیں۔ اپنے سفرنامے ہنزہ داستان میں وہ اپنے بیٹے سلجوق کے ساتھ پولو کھیل کی تلاش میں نکلتے ہیں اور ہنزہ میں ایک جگہ انھیں پولو دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ گلگت اور اس کے گردونواح میں پولو کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اس کھیل کا احوال کچھ یوں بیان کیا:

”گلگت کی پرانی پولو گراؤنڈ کی سطح پر ریت بچھی ہوئی ہے گھوڑا اس پر دوڑ رہا ہے، لشکتے ہوئے جثے، لامبے منہ اور بالوں والی گردوالا چوپایہ اس میں ایک وحشی تکبر ہے جو زمین پر اترا کر چلتا ہے۔۔۔ سفید سیاہ اور سرمئی رنگ کے جانوروں کے جلد قراقرم کی سیاہیوں کے اوپر پہلے چمکتے اور اب ماند پڑتے زرد سورج کی کرنوں میں رنگ بدلتی ہے اور اسی رنگ کے ہیں جو گلگت سے

پرے ننگی چٹانوں کے اوپر سے جھانکتی ایک برف پوش چوٹی کا ہے۔۔۔ ہوا میں سرد سندیسے ہیں، شام ہو رہی ہے اور پولو میچ جاری ہے۔ ان گھوڑوں کو یوں ہانپتے، حملہ آور ہوتے دیکھ کر ایک قدیم دفاعی حس میرے اندر پہلو بدلتی ہے، مجھے اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتی، بے آرام کرتی ہے۔ میں چوکس رہتا ہوں جیسے ہی یہ حملہ اور جانور ہیں جو گئے زمانوں میں آئے تھے اور جنھوں نے میرے کھیتوں کی ہریاول کو روندا تھا چناں چہ میں اب بھی چوکنا ہوں اور اپنے آپ کو ایک انجانے خطرے میں محسوس کرتا ہوں۔ پتھر کی چار دیواری پر گلگتی چوغوں اور اونی ٹوپیوں میں ملبوس موسیقاروں کا ایک گروہ آلتی پالتی مارے بیٹھا پورے جوش و خروش سے اپنی سانسیں اور اپنے ہاتھ چلا رہا"(17)

پاکستان کے شمالی علاقے دیومالائی قصوں سے بھرے پڑے ہیں۔ کسی علاقے کی تہذیب جس قدر قدرت کے قریب ہو گی اتنا ہی دیومالائی ادب زیادہ سامنے آئے گا۔ ان میں سے کچھ داستانیں حقیقت ہوں گی اور کچھ افسانے، کچھ اساطیری قصے ہوں گے اور کچھ حقائق پر مبنی۔ مستنصر شمالی علاقہ جات کی جس وادی میں بھی گئے وہاں انہوں نے یہ داستانیں سنیں۔ ان داستانوں کو انہوں نے اپنے سفرناموں کا حصہ بنایا۔ داستانیں وہاں کی تہذیب کا ایک اہم جزو ہیں۔ یہ محیر العقول داستانیں ہیں ان کو اگر آپ شک کی نگاہ سے دیکھیں تو مقامی لوگ برامان جاتے ہیں۔ چترال داستان میں وہ لکھتے ہیں:

"میں نے نانگا پربت میں ایک مولوی صاحب کا تذکرہ کیا ہے جو وادی خپلو کے ایک گاؤں میں رہنے والے پریوں کے بچے مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ نانگا پربت کے ٹاپ میدان میں الاؤ کی روشنی میں مجھے پچھل پیری اور بلاؤں کے ایسے قصے سنائے گئے تھے کہ ان پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا"(18)

شمالی لوگ بے حد مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مہمان کو کھانا کھلانا ہمارے مذہب کا ایک اہم ترین جزو ہے۔ اسی لیے ان کی مہمان نوازی مثالی ہے۔ مستنصر کو شمشال ہنزہ اور واخان کے لوگوں کی مہمان نوازی بہت اچھی لگی۔ وہ ان کی مہمان نوازی کو کبھی بھی فراموش نہیں کر پائے ان کا پہلا سفر ہنزہ کا سفر تھا جہاں ان کی ملاقات ماسٹر حقیقت سے ہوئی۔ ماسٹر حقیقت کی مہمان نوازی اور پر خلوص رویے کو وہ جابجا اپنے دیگر سفرناموں میں بھی بیان کرتے نظر آتے

ہیں۔ مہمان نوازی محض باسیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ گوجر بھی اس چیز کا خصوصی طور پر خیال کرتے ہیں۔ گوجر قوم کو بکروال بھی کہا جاتا ہے یہ لوگ اپنے مویشیوں کے ساتھ ہمیشہ محو سفر رہتے ہیں۔ خوراک کا کم ذخیرہ ہونے کے باوجود اگر انہیں کوئی مسافر میسر آجائے تو اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ یاک سرائے کے حوالے سے مستنصر نے گوجر قبیلے کا احوال کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ”گوجر حضرات جو دراصل امت کے باسی تھے ان ویرانوں میں ایک مدت سے رہتے تھے۔۔۔ ان کی شباہتوں پر تنہائی اور کٹیلے سرد موسموں کی عبارتیں تھی۔۔۔ وہ از حد مہمان نواز تھے۔۔۔ چونکہ انہیں ادھر مہمان نوازی کے مواقع کم کم ملتے تھے اس لیے انہوں نے ہمیں خوب نوازا۔۔۔ فوری طور پر تازہ دہی اور گاڑھی لسی پیش کی گئی۔۔۔ لسی کے ہر گھونٹ کے ساتھ بے چینی اور گھبراہٹ زائل ہوتی گئی۔“(19)

مستنصر حسین تارڑ کو ان علاقوں کی مہمان نوازی نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ جب بھی، جہاں بھی شمالی سفر پہ گئے لوگوں نے ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ مستنصر کا سفر انجانی وادیوں کی طرف تھا۔ بظاہر ایسے علاقے میں جہاں عام انسان تہذیب کا نہیں سوچتا لیکن یہاں تہذیب ہر جگہ تھی۔ جو تکریم مستنصر کو ملی اس کا وہ بار بار ذکر کرتے ہیں۔ ان علاقوں کی روایات بہت بھلی اور دلکش ہیں۔ ”چترال داستان“ میں انہوں نے مہمان نوازی کی روایت کا ذکر کیا ہے۔ ان کے ہر سفر نامے میں متعدد جگہ پر آپ کو ایسے اقتباسات نظر آئیں گے جن میں اہل شمال کی مہمان نوازی پر بات کی گئی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”مجھے۔۔۔ ان خطوں کی مہمان نوازی کی یہ روایت بے حد بھلی لگی کہ خاتون خانہ۔۔۔ ایک بڑا سا آفتابہ اٹھائے۔۔۔ ایک چلمچی آپ کے آگے رکھتی ہے، ظاہر ہے آپ فرش پر بچھے دستر خوان پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ اور آپ کے ہاتھ دھلاتی ہے۔۔۔۔۔۔ برآمدے کے کچے فرش پر بچھے دستر خوان پر جو خوراک سجی تھی ان میں سے بیشتر کے ذائقے ناآشنا تھے اور وہ لاہور کی نسبت واخان اور ازبکستان کی قربت میں تھے۔ کیونکہ یہ علاقے بھی تو لاہور کی نسبت طاؤس سے زیادہ قریب تھے۔ ناشتے کے بعد ہم اس زمان و مکان سے باہر آئے۔۔۔“(20)

پاکستان کے شمالی علاقہ جات معاشرتی سطح پر بہت مضبوط ہیں جہاں رواداری اور مساوات کا عنصر نمایاں ہے۔ ان وادیوں میں زندگی آسان نہیں ہے ،مشکلات بہت زیادہ ہیں۔ ان کو صرف اسی صورت میں برداشت کیا جاسکتا ہے جب تمام لوگ اکٹھے ہوں۔ مستنصر کے خیال میں یہ لوگ صلح جو ہیں اس کی ایک وجہ ان لوگوں پر بدھ مذہب کے اثرات ہیں جو ابھی باقی ہیں۔ ایسی جگہ جہاں آبادی کم ہو اور زندگی مشکل، وہاں اکٹھے رہنا کہیں مصلحت ، کہیں مجبوری اور کہیں لازم ہوتا ہے۔۔ یہ لوگ ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اور مشکل پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے شمال کے دور دراز وادیوں کی رسم و رواج کو بھی بیان کیا ہے۔ مستنصر نے شمال کی مختلف تقریبات میں شمولیت اختیار کی۔ اس لیے وہ یہاں شادی بیاہ اور غم کی رسومات کو بھی اپنے سفر ناموں کا موضوع بناتے ہیں۔ مرگ کا تصور ان کے سفر ناموں میں بارہا آیا ہے۔ کسی بھی علاقے کی تہذیب کے حوالے سے رسومات انتہائی اہم ہیں۔ رسومات شادی بیاہ کے علاوہ بدلتے موسم اور نئی رتوں کے پھلوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ وادی اشکومن کے پانچ بڑے تہواروں کا ذکر انہوں نے اپنے سفر نامے "یاک سرائے" میں کیا ہے ان تہواروں کے نام درج ذیل ہیں:

"بی تہوار" یہ ہر سال یکم مارچ کو منایا جاتا ہے۔ اس دن لوگ اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے اور بیج بوتے ہیں شام کو گھر میں الاؤ روشن کیا جاتا ہے اور ایک خاص رسم "رسم ہیماس" ادا کی جاتی ہے۔ گھر میں روشن الاؤ میں آٹا پھینکا جاتا ہے تاکہ زمین زرخیز ہو اور خوراک کی فراوانی ہو، یہ تہوار ان دنوں کی یادگار ہے جب انسان فطرت سے قریب ہوتا تھا۔

"نیسنو گوٹ" یکم جولائی کو منایا جاتا ہے۔ اس دن سورج غروب ہونے سے پہلے گندم کی بالیاں کاٹ کر گھر لائی جاتی ہے اور انہیں گھر کی بیرونی دیوار پر لٹکا دیتے ہیں۔ مستنصر کے لے یہ بات حیرت کا باعث ہے کہ کہیں نہ کہیں ثقافتی رسومات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ چاہے انسان کسی بھی علاقے میں زندگی کرتا ہو۔ ان کے خیال میں رسومات اور ثقافت کی یکجہتی اس لیے ہے کہ نسل انسانی کا آغاز ایک تھا۔ مختلف قبائل اور نسلیں منتشر ہوتی گئیں۔ ان کی آبائی زندگی مشترک تھی اس لیے رسومات بھی مشترک رہیں اگرچہ علاقائی سطح پر ان میں کچھ تبدیلی آگئی۔

"نیلٹ بوجوک" بیس جون کو یہ تہوار منایا جاتا ہے اس دن تمام لوگ اپنے مال مویشی لے کر پہاڑوں کی طرف جاتے ہیں۔ ان کا یہ سفر بلند چراگاہوں کی طرف ہوتا ہے جہاں وہ پورا گرمی کا موسم قیام کرتے ہیں۔

"نیلو وایوگ" یہ تہوار بیس ستمبر کے آس پاس منایا جاتا ہے اس وقت سرما کا آغاز ہو جاتا ہے اور لوگ نالوں سے نیچے آتے ہیں اور گاؤں کے گھروں میں جا کر دودھ اور مکھن کی صورت میں تحفہ پیش کرتے ہیں۔

"ناسالو" یہ آخری تہوار ہے جو نومبر میں منایا جاتا ہے اس دن اشکومن کے ہر گھر میں جانور کی ذبح کیا جاتا ہے تا کہ سردیوں میں خوراک کی کمی کا سامنا نہ ہو۔ برفباری کے دنوں میں اس گوشت کو استعمال کیا جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے شمالی علاقہ جات میں سیاحت کے دوران یہاں کے مقامی لوگوں کے طرز زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ اس زندگی کی تمام جزئیات کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے جو جو پیشے اختیار کیے وہ ان کو بھی بیان کرتے ہیں کیوں کہ پیشے تہذیب کا ہی ایک مظہر ہیں۔ شمالی علاقہ جات میں کئی پیشے اختیار کیے جاتے ہیں اس میں زراعت، مال مویشی پالنا اور سیاحت سے متعلقہ پیشے سب سے اہم ہیں۔ اس علاقے کی ترقی میں سیاحت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں پر سیر وسیاحت کا سارا دارومدار اسی شاہراہ قراقرم پر ہے۔ اس شاہراہ کے بننے سے پہلے دوسرے ممالک کے کوہ پیما یہاں کا رخ کرتے تھے۔ ستر کی دہائی کے بعد مقامی افراد بھی اس میں شریک ہونے لگے۔ شمال کے لوگوں نے اس پیشے کو اختیار کیا کیونکہ وہاں رزق کمانے کا بہترین ذریعہ سیاحت ہے۔ گلگت بلتستان کا ہر آدمی کبھی نہ کبھی پورٹر ضرور بنتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کا احوال دیکھیں تو وہ قصاب، موچی، اور دیگر پیشہ وروں کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے ساتھ پہاڑوں پر گئے کبھی پورٹر بن کر تو کبھی گائیڈ بن کر بلکہ یوں بھی ہوا کے آج کا پورٹر کل کا گائیڈ بنا۔ مستنصر حسین تارڑ سے راقم الحروف نے ایک انٹرویو کیا جس میں شمالی علاقہ جات اور پورٹروں کے بارے میں کہتے ہیں:

> "شمالی علاقہ جات کا ہر آدمی زندگی میں کبھی نہ کبھی پورٹر ضرور بنتا ہے اور اس میں حرج ہی کیا ہے کیونکہ اس کے بڑے فائدے ہیں۔ مہم کے دوران کھانا بہترین ملتا ہے، پیسے ملتے ہیں، پورٹروں کے ہاں یہ رواج ہے کہ انہیں مہم کے دوران بکرے کا گوشت کھلایا جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ واپسی پر کوہ پیما اپنا فالتو سامان یہیں چھوڑ جاتے ہیں نذیر صابر پہلے پورٹر تھا پھر نادرن ایریا کونسل کا ممبر بنا، کے۔ٹو گیا ایورسٹ سر کرنے والا پہلا پاکستانی تھا۔ ان کی زندگی شروع ہی سے ایسی ہوتی ہے جس میں مشکلات ہوتی ہے لیکن کوہ پیمائی کے حوالے سے انہیں ڈائریکشن اب ملی ہے۔"(21)

انسانی تہذیب کا ارتقا ایک طویل اور پیچیدہ سفر کی کہانی ہے، جو ہزاروں سال پر محیط ہے۔ ابتدائی دور میں انسان غاروں میں رہنے والا ایک شکاری اور خوراک جمع کرنے والا جاندار تھا، لیکن آگ کی دریافت اور زراعت کی ایجاد نے زندگی کے انداز کو یکسر بدل دیا۔ مستقل رہائش، سماجی ڈھانچوں کی تشکیل، اور زبان کے ارتقا نے تہذیب کے ابتدائی عناصر کو جنم دیا۔ وقت کے ساتھ، انسان نے دھاتوں کی کاریگری، تجارت، اور شہری ریاستوں کی بنیاد رکھی، جس سے علم، فن، اور ثقافت کا فروغ ممکن ہوا۔ مذہب اور فلسفے نے زندگی کے بنیادی سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی، جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو کائنات کے رازوں کو سمجھنے کے قریب تر کر دیا۔ صنعتی انقلاب سے ڈیجیٹل دور تک، انسانی تہذیب نے حیرت انگیز ترقی کی، مگر یہ سفر چیلنجز سے خالی نہیں رہا؛ وسائل کی کمی، ماحولیاتی تبدیلی، اور سماجی عدم مساوات جیسے مسائل نے انسانیت کے لیے نئے سوالات پیدا کیے۔ تہذیب کا یہ ارتقا انسان کے اجتماعی تجربے، تخلیقی صلاحیت، اور مستقبل کی امید کا عکاس ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے تاریخ اور تہذیب کے متلاشی کی حیثیت سے پاکستان کے شمال کے لوگوں کی تہذیب کو موضوع بنایا ہے اور تہذیب وتمدن کے حوالے سے کام کرنے والے محققین کو بھی ان وادیوں میں پوشیدہ تہذیب کی کھوج کی ترغیب دلائی ہے۔

حوالہ جات

1 وزیر آغا، ڈاکٹر، کلچر کے خدوخال، لاہور: مجلس ترقی ادب، 2009ء، ص 69 تا 70

2 سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، کراچی: مکتبہ دانیال، 2012ء، ص 13

3 سر سید احمد خاں (تہذیب الاخلاق)، مقالات سر سید، جلد 6، لاہور: 1962ء، ص 3

4 سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، کراچی: مکتبہ دانیال، 2012ء، ص 260

5 ساجد امجد، ڈاکٹر، پروفیسر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، س ن، ص 23

6 وزیر آغا، ڈاکٹر، کلچر کے خدوخال، لاہور: مجلس ترقی ادب، 2009ء، ص 71

7 عبداللہ، سید، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1977ء، ص 41

8 ا وزیر آغا، ڈاکٹر، کلچر کے خدوخال، لاہور: مجلس ترقی ادب، 2009ء، ص 88

9 سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، کراچی: مکتبہ دانیال، 2012ء، ص 301

10 احمد ندیم قاسمی، خلیفہ عبدالحکیم، محمد اجمل، ثقافت کیا ہے، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 2012، ص8

11 ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، مختصر تاریخ وزبان وادب گلگت بلتستان (شمالی علاقہ جات)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 2009، ص30

12 مستنصر حسین تارڑ، چترال داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2016ص22، 21

13 مستنصر حسین تارڑ، حراموش ناقابل فراموش، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2017ص189

14 راقم الحروف کا مستنصر حسین تارڑ سے انٹرویو، مورخہ 15 مئی 2018

15 مستنصر حسین تارڑ، شمشال بے مثال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ص223، 222

16 مستنصر حسین تارڑ، چترال داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000 ص36

17 مستنصر حسین تارڑ، ہنزہ داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ص99، 100

18 مستنصر حسین تارڑ، چترال داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2016ص18

19 مستنصر حسین تارڑ، یاک سرائے لاہور، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2004ص186

20 مستنصر حسین تارڑ، چترال داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2016ص26

21 راقم الحروف کا مستنصر حسین تارڑ سے انٹرویو، مورخہ 15 مئی 2018